شخصیتِ ابراہیم علیہ السلام کا سماجی پس منظر: قرآن، بائیبل اور جدید اثری شواہد کی روشنی میں

The Social Background of prophet Abraham Peace be upon him in light of the Quran, Bible, and Modern Archaeological Finding

حافظ محمد شارق* ڈاکٹر اورنگزیب خارانی** ڈاکٹر فاطمہ سبا***

ISSN (P) 2664-0031 (E) 2664-0023
DOI: https://doi.org/10.37605/fahmiislam.v5i2.358

Received: December 13,2022
Accepted: December 22, 2022
Published: December 30,2022

Abstract

Prophet Abraham is the father of the three Abrahamic faiths: Judaism, Christianity, and Islam. His unshakable devotion and obedience to God have earned him respect from all three religions. The life of Prophet Abraham is richly documented in sacred texts. However, due to a lack of archaeological evidence, many contemporary philosophers view the figure of Abraham (a.s) as mythology. However, there are no in-depth descriptions of Abraham's life in ancient sources. Still, Modern archaeology has many findings which confirm the historicity of this Semitic figure and its society, even his name. Excavations in Egypt, Iraq, Palestine, and Syria have revealed artifacts, inscriptions, and other things that correspond to Abraham's social background described in the Bible and Quran.

This article is an attempt to presents social background of Prophet Abraham (as) as described in the Quran and Bible. In order to prove that Abraham was a real person, the research will also show that how these facts can be confirmed by modern archaeology.

Keywords: Prophet Abraham, Abrahamic faiths: Judaism, Christianity, and Islam, Modern archaeology.

---

* لیکچرار، شعبہ مطالعہ ادیانِ عالم، وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی hmshariq@gmail.com

** لیکچرار، شعبہ علوم اسلامی، بحریہ یونیورسٹی، کراچی۔

*** لیکچرار، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامیات، شہید بینظیر بھٹو وومن یونیورسٹی، پشاور۔

تمہید

یہودیت اور دیگر ابراہیمی مذاہب کے جدِ امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں مذاہب میں آپ علیہ السلام کی حیثیت یکساں طور پر مسلم ہے۔ حتیٰ کہ ابراہیمی مذاہب کی آخری کڑی اسلام کو خود اس کے متون میں دین ابراہیم قرار دیا گیا ہے۔[1] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بائیبل اور قرآن دونوں میں ہی موجود ہے۔ قرآن مجید میں آپ علیہ السلام کے بارے میں کئی واقعات منقول ہیں، جو یقیناً قابل اعتبار بھی ہیں، لیکن اپنے منفرد اسلوب کے پیش اس حوالے سے کافی ایجاز و اختصار پایا جاتا ہے۔ دوسری جانب بائیبل اس ضمن میں تفصیل فراہم کرتی ہے لیکن بیرونی اثرات کے پیش نظر وہ تفصیل قدرے ناقابل اعتبار ہے۔ زیر نظر مقالے میں ہم جدید علم الآثار، تاریخ اور قرآنی اور بائیبل کی روشنی میں تاریخی غلطیوں سے دامن بچاتے ہوئے ہم کچھ بنیادی حقائق پر روشنی ڈالیں گے۔

موضوع کی اہمیت

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی امم سابقہ کی تاریخ اور ان کے عبرت انگیز واقعات بیان کیے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ قرآن کے ہر چند ورق بعد کسی سابقہ امت یا شخصیت کا ذکر موجود ہے۔ قرآن مجید کے ان مضامین کو اصولِ تفسیر میں "علم التذکیر" کہا جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ علم تذکیر کے بارے میں لکھتے ہیں: علم التذكير بايام الله وهو بيان تلك الوقائع والحوادث التى احدثها الله تعالىٰ انعاماً على المطيعين ونكالا للمجر مين كقصص الانبياء عليهم الصلوات والتسليمات ومواقف شعوبهم واقوامهم مبهم (علم تذکیر بایام اللہ سے مراد ان واقعات اور حوادث کا بیان ہے جو اطاعت کرنے والوں پر انعام کے طور پر اور مجرموں پر عذاب کے طور پر وارد ہوئے تھے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے ساتھ ان کے قبیلوں اور اقوام کے مقامات۔)[2]

قرآن مجید مخاطبین کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ سیاحت کریں اور خدا کی نافرمانی کرنے والوں کا انجام حسی شواہد (Empirical Evidence) کے ساتھ دیکھیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

سِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ[3]

زمین میں سیر کر کے دیکھو، مجرموں کا انجام کیسا ہوا ہے۔

مذکورہ آیت کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جو قصص و واقعات منقول ہیں ان واقعات کو بیان کرنے کا فلسفہ یہی ہے کہ لوگ عبرت حاصل کریں اور اس امر کو محققین نے قرآن مجید کے بنیادی موضوعات میں شامل کیا ہے۔ دراصل اسی تذکیر بایام اللہ کی ایک جہت (Dimension) آثار قدیمہ کا مطالعہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آثارِ قدیمہ (Archaeology) حقیقتاً علوم القرآن کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ قرآن فہمی کے لیے بھی علم الآثار کی اہمیت کے بارے میں برصغیر کے مشہور مفسر علامہ عبد الماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

اگر صحیح نقطہ نظر اور ایمان و معرفت کے پہلو سے (آرکیالوجی کا) مطالعہ کیا جائے تو یہ بجائے خود ایک جہاد ہے۔[4]

خود پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور کسی سفر کے دوران کہیں کسی قوم کے باقیات ہوتے تو آپ اس کی نشاندہی ضرور کرتے تھے۔ تاہم آپ کا یہ طریقہ تھا کہ اس جگہ زیادہ قیام نہیں کرتے تھے کیونکہ ان جگہوں کو دیکھنے کا مقصد تفریح نہیں عبرت ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدائن صالح سے گزرے تو آپ نے صحابہ کرام کو مختلف جگہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی تفصیلات سے آگاہ کیا تاکہ انھیں قرآن میں بیان کردہ واقعات پر مزید تیقین حاصل ہو۔

سابقہ کام کا مطالعہ

علم تاریخ اور مذہب کے باہمی مطالعے پر بہت سے جید محققین نے قلم اٹھایا ہے۔ مسیحی اور یہودی اسکالرز کے ہاں Biblical Archaeology کے نام سے پورا ذخیرہ موجود ہے جو بائبل کے واقعات کو علم الآثار کی روشنی میں جائزہ لینے کی کاوش ہے جبکہ مسلمان اہل علم کے ہاں تاریخ ارض

القرآن کے عنوان سے یہ لٹریچر موجود ہے۔ مسیحی اور یہودی اسکالرز سے کئی زمانوں پہلے مسلمانوں کے دورِ عروج سے ہی مسلم حکما اس علم کی اہمیت و افادیت سے بخوبی واقف تھے اسی لیے ہمیں ایک بہت بڑی تعداد میں ایسے محققین کا نام ملتا ہے جنھوں نے قرآن مجید کی ذکر کردہ اقوام اور بستیوں کی جانب سفر کرکے آثار و شواہد کے احوال لکھے ہیں اور کئی کتبات کے بھی حوالے دیے ہیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں ان مقامات (Heritage) سے دریافت ہونے والے کتبات کے باقاعدہ تراجم بھی کیے گئے۔ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں حضر موت میں منہدم شدہ قلعہ "حصن غراب" سے ایک کتبہ ملا جس میں قومِ ھود کا ذکر موجود تھا۔ یہ کتبہ اور اس کا ترجمہ علامہ شہاب الدین نویری (677ھ) نے اپنی تاریخ مسالک الابصار میں نقل کیا ہے۔[5]

تیسری صدی ہجری (c. 930) کے مشہور سائنس دان ابو بکر احمد بن علی المعروف ابن وحشیہ پہلے ایسے شخص تھے جنھوں نے قدیم مصری رسم الخط کے معانی بے نقاب کیے اور بہت سی مصری علامات کے عربی مطالب اپنی تصنیف "کتاب شوق المستھام" میں لکھے۔ اس طرح سے مغربی دنیا کا یہ مشہور مفروضہ بھی بالکل غلط ہے کہ مصریوں کے قدیم خط میخی (Egyptian Hieroglyphs) کی رمز کشائی (Decipher) سب سے پہلے تھامس ینگ نے کی۔ اس کے علاوہ یاقوت حموی نے "معجم البلدان" میں کئی قدیم کتبات اور ان کے تراجم لکھے ہیں۔ ابن حائک ہمدانی اس بابت زیادہ مشہور ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی کتاب "اکلیل" میں ایک پورا باب انھی کتبات اور عمارتوں کے تذکرے کے لیے خاص کیا ہے اور اپنی دوسری مایہ ناز تصنیف صفۃ جزیرۃ العرب میں بھی کئی کتبات کے تراجم بھی کیے ہیں۔ اس کے علاوہ مشہور سائنس دان موسیٰ الخوارزمی نے بھی اپنی کتاب "صورۃ الارض" کی تصنیف میں خاص طور پر اصحاب کہف کی تحقیق کی غرض سے کئی اسفار کیے اور ان تمام مقامات کے مشاہدات کیے جنھیں اصحاب کہف سے منسوب کیا جاتا ہے۔

یہ تمام حوالہ جات گواہی دیتے ہیں کہ ماضی میں مسلم اہل علم اس میدان میں ایک اچھی محنت کر چکے ہیں اور یہ تمام آثار جو ماضی کے اہل علم کو دستیاب تھے، ان میں سے بہت سے ہمارے پاس موجود نہیں ہیں لیکن ہم ان محققین کی شہادتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ان سے بخوبی

استفادہ کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں مسلم مورخین کی جانب سے آرکیالوجی، بالخصوص خطہ عرب کے حوالے سے بہت کم ہی توجہ دی جارہی ہے۔ اس ضمن میں ماضی قریب میں اس موضوع پر علامہ سید سلیمان ندوی نے ''تاریخ ارض القرآن'' لکھی، سر سید احمد خاں مرحوم نے بھی خطباتِ احمدیہ میں اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اپنی ممتاز تفسیر تفہیم القرآن میں جغرافیۂ قرآن پر تاریخ کی روشنی میں اچھی بحث کی ہے، تاہم ان سبھی کتابوں کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور سوائے تاریخ ارض القرآن کے یہ کتب بھی خاص اس موضوع پر نہیں بلکہ ان میں ضمنی طور پر یہ مباحث آئے ہیں۔ تاہم اب ہر گزرتے دن کے ساتھ نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں جن سے موجودہ مسلم اہل علم کی اکثریت بے خبر ہے۔

اس وقت انگریزی یا عربی زبان میں اس ضمن میں جو کام کیا گیا ہے ان میں بیشتر شواہد آہنی دور(Iron Age) سے تعلق رکھتے ہیں؛ نیز وہ تحقیقات یہ ضرور ثابت کرتی ہیں کہ مشرق وسطیٰ کہ ایک خانہ بدوش عموری گروہ موجود تھا جو کنعان میں سیاسی اقتدار کے لیے کوشاں تھا، نیز اس لٹریچر میں پدری گروہ(Patriarchal Narratives) کو ثابت کیا گیا ہے، لیکن کچھ سوالات ایسے ہیں جن کے جوابات تاحال تشنہ جواب ہیں:

۱۔ ابراہیم علیہ السلام کا اُر واقعی جنوب میں واقع تھا یا شمال میں؟

۲۔ کیا آتش نمرود کی کوئی اثری شہادت اور مثال اُس زمانے میں موجود ہے؟

۳۔ اسمِ ابراہیم ایک ہزار قبل مسیح سے پہلے بھی ملتا ہے یا یہ پورا بیانیہ آہنی دور کی داستانوں کی یادگار ہے؟

۴۔ کیا مصر اور کنعان میں عبرانیوں کی ہجرت کی کوئی شہادت موجود ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات ہمیں جدید اثری شواہد کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ جدید اکتشافاتِ اثریہ سے بخوبی فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن کی تفہیم کو مزید بہتر بنایا جائے اور قرآن مجید کے بیان کردہ تاریخی حقائق کو عصری بنیادوں پر ثابت کرکے پیش کیا

جائے۔اس لیے ہم یہ کہنے پر حق بجانب ہیں کہ یہ مقالہ اس سلسلے میں موجود انھی سوالات کی خلا کو پُر کرنے کی کوشش ہے۔

تحقیق کے مقاصد

بہت سے ماہرین اور جدید اذہان شخصیتِ ابراہیمی کی تاریخیت (Historicity) کے بار میں متشکک ہیں؛ کیونکہ ان کے خیال میں آپ علیہ السلام کے بارے میں تاریخی شواہد ناکافی ہیں۔ جان وان سیترز نے اپنی کتاب Abraham in History and Traditions میں ان اثری شواہد پر تنقید کی ہے جو آپ علیہ السلام کی تاریخیت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان شواہد کا تعلق دو ہزار قبل مسیح کے بجائے آہنی دور یعنی ہزار قبل مسیح کے بعد کا ہے۔[6] اسی طرح معروف آرکیالوجسٹ ڈیور بھی کہتے ہیں کہ "اکثر ماہرین اثریات اب یہ امید چھوڑ چکے ہیں کہ کسی بھی طرح ہم ابراہیم، اسحاق یا یعقوب [علیہ السلام] کو تاریخی شخصیات ثابت کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس اس بارے میں کوئی بھی اثری شہادت میسر نہیں ہے۔"[7] راقم کی رائے میں اب یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ سن 2000ء کے بعد ہونے والی کھدائیوں سے کئی مزید شواہد ہمیں مل چکے ہیں اور ماضی میں بھی دریافت ہونے والے کئی شواہد ایسے ہیں جن کی توجیہات درست نہ ہونے کی وجہ سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے وہ سماجی پس منظر جو مقدس صحائف بیان کرتے ہیں؛ اس کی تصدیق اثری شواہد نہیں کرتے۔ یہ شواہد ہم موقع محل پر پیش کریں گے۔

اس تحقیق کا مقصد یہی ہے کہ مذہبی صحائف میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے معاشرے کے بارے میں جو قرائن بتائے گئے ہیں ان کا جائزہ اثری شواہد کی روشنی میں کیا جائے تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کوئی فرضی یا افسانوی کردار نہیں بلکہ آپ کی تاریخیت ایک علمی حقیقت ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم مستند مصادر سے اثری شواہد اس تحقیق میں پیش کیے گئے ہیں جن میں آرکیالوجیکل سوسائٹیز کے جرنلز، سائنسی خبریں شایع کرنے والے جرائد اور اخبارات، ویب سائٹس اور تاریخ کی کچھ کتابیں شامل ہیں، نیز کئی مواقع پر مقدس صحائف سے بھی حوالہ جات نقل کیے گئے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کا خاندانی پس منظر

ابراہیم علیہ السلام سامی اقوام کے جد امجد سمجھے جاتے ہیں؛ اور خود آپ علیہ السلام کا تعلق بھی سامی قوم سے بتلایا جاتا ہے۔ بائیبل کے مفروضے کے مطابق طوفان نوح کے بعد ان کے بیٹے سام کی سفید فام اولاد بین النہرین کی وادیوں، جزیرہ عرب، بحر احمر کے جنوب اور بحر ہند کے مغربی خطوں میں آباد ہو گئے تھے۔[8] اسی حوالے سے آرامی، عموری، فینیقی، بابلی، عبرانی اور عربی نسل آبادیوں کو سامی کہا جاتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ سامی قوم طوفان نوح کے بعد یعنی کم از کم 5000 قبل مسیح کے بعد وسط ایشیا میں آرمینیا سے ہی ہجرت کرکے مشرق وسطیٰ کی جانب آ گئے۔ یہ مفروضہ بائبل کے مطابق ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ "میرا باپ ایک خانہ بدوش آرمینین تھا۔[9] لیکن مورخین وسیع تناظر میں یہی تسلیم کرتے ہیں سامی کوئی نسلی گروہ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مشرقِ وسطیٰ کے باشندوں سے مل کر سامی زبانیں تشکیل دی۔

بائیبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبیلے کے لیے لفظ عبرانی استعمال ہوا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ خصوصی طور پر بنی اسرائیل کے لیے مختص کر دیا گیا۔ اس لفظ کی اصل اور اس کے معنی کے بارے میں دو مفروضے ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ "عبر" یا "عابر" نام کے ایک سامی النسل سردار تھے۔ یہ مشہور پیغمبر صالح کے بیٹے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب عبر بن شالح بن ارفخشند بن سام بن نوح ہے۔ یہ کنعان میں پیدا ہوئے تھے اور انھی عبر کی نسبت سے انھیں عبرانی کہا جاتا ہے۔ اگر ہم اس مفروضے کو تجزیے کے لیے پیش کریں تو منقول روایات اس کی تصدیق کر دیتی ہیں۔ یہودی اور مسلم قصوں کے مطابق (Selah) کا زمانہ لگ بھگ تین ہزار قبل مسیح ہے۔ قرآن میں بھی اس پیغمبر کا ذکر موجود ہے جو عہد ابراہیمی سے قبل کم و بیش 3000BC میں قوم ثمود کی جانب مبعوث کیے گئے تھے۔ اگر قرآن اور بائیبل کے عربی النسل

صالح ایک ہی ہیں اور عبر انھی کی اولاد میں سے ہیں تو ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ عبرانی ساامیوں کا ہی ایک گروہ تھا جو اپنی اصل میں عربی النسل ہی تھے تاہم یہ واضح رہے کہ ان کی زبان مختلف تھی۔ اطلس القرآن کے مصنف لکھتے ہیں:

"عبری یا عبرانی کی اصطلاح کا اطلاق دوسری ہزاروی قبل مسیح [2000BC] کے زمانے میں جزیرۂ عرب کے شمالی علاقے اور صحرائے شام میں رہنے والے عربی قبائل اور اس علاقے کی دوسری عربی اقوام پر کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ لفظ عبری صحرائی اور بدوی کا ہم معنی بن چکا تھا۔ فرعونی اور مسماری نوشتوں میں "ابری" "ھبیری" اور عبیرو کے الفاظ بھی اسی معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس وقت اسرائیلیوں ، موسویوں یا یہودیوں کا وجود تک نہ تھا۔"[10]

اس بارے میں دوسرا نظریہ بھی ہماری توجہ کے قابل ہے کہ لفظ عبر (عبرانی میں اِور) کے معنی عبور کرنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ جب عربی النسل سامی گروہ بین النہرین سے کنعان میں وارد ہوا تو مقامی لوگوں نے انھیں "اِور" (Passers) کہا، جس کے معنی یہ تھے کہ یہ لوگ دریا کی دوسری جانب سے آئے ہیں۔ بائیبل کا یہ بیان کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ سے یہ وصیت کی کہ ان کے بیٹے کی شادی کنعانیوں میں نہیں ہونی چاہیے، بلکہ ان کے آبائی وطن سے ہونی چاہیے، صاف ظاہر کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل کنعان کی قدیم نسل سے بالکل مختلف تھی۔[11]

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہے سامی کوئی خاص نسل کے بجائے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ تھے، جبکہ عبر صالح علیہ السلام کی اولادوں میں سے تھے جو دریاپار سے کنعان میں آئے تھے۔ وسط ایشیائی آریا اور عبرانیوں کا ایک ملا جلا خانہ بدوش گروہ عموری تھا۔ شرق وسطیٰ کی تاریخ میں اس خانہ بدوش قوم کا تذکرہ بھی بارہاں آتا ہے جنھیں "عموری" (Amorites) کہا جاتا ہے۔ بائیبل کا بیان کردہ نسب نامہ اور خود آپ کا غیر سامی نام بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نسلی اعتبار سے آپ کنعان کی قدیم

قوم سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ اُس سامی گروہ سے تھے جو خانہ بدوش عموریوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ مشہور فرانسیسی مصنف سینویس لکھتے ہیں:

"قدیم کلدانی سلطنت کے زمانہ میں کچھ ایسے خانہ بدوش کلدانیوں کے گروہ تھے جو فرات اور شام کے درمیانی وسیع زمین میں نقل و حرکت کرتے رہتے تھے۔ ہر گروہ بزرگ اُس جماعت کا شیخ ہوتا تھا۔ یہ شیخ اپنے ساتھ بہت سی عورتیں، بچے، نوکر چاکر رکھتے تھے۔ یہ سب ایک بڑے خاندان کی طرح زندگی بسر کرتے اور اپنے شیخ کے فرماں بردار رہتے تھے۔ ہر خاندان بکریوں، بھیڑوں اور اونٹوں کے گلّے رکھتا تھا۔ جس زمین میں مویشی کے چرنے کے قابل گھاس پاتے تھے وہیں قیام کرتے تھے اور اونٹوں کی کھال کے خیمے قائم کرکے اُن میں رہتے تھے اور جب اُس سرزمین کی گھاس ختم ہو جاتی تھی تو دوسری زمین کی تلاش میں روانہ ہو جاتے تھے۔"[12]

صحراؤں میں رہنے والے یہ لوگ سردار کے ماتحت زندگی گزارتے تھے جو بالعموم خاندان کا بزرگ ترین فرد ہوا کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اُن ہی شیوخ میں سے ایک تھے۔[13] کیرن آرم اسٹرانگ لکھتی ہیں:

ہمیں ابراہام کا کوئی ہم عصر ریکارڈ نہیں ملتا لیکن محققین کا خیال ہے کہ وہ ان سیلانی سرداروں میں سے ایک ہوں گے جو تین ہزار برس قبل مسیح میں اپنے لوگوں کو میسوپوٹیمیا سے میڈی ٹرینیئن کی طرف لے کر گئے۔ یہ جہاں گرد مغربی سامی زبانیں بولتے تھے جن میں عبرانی بھی شامل تھے۔ وہ بدوؤں جیسے مستقل خانہ بدوش نہیں تھے ۔ ان کی ثقافتی حیثیت صحرانشینوں سے برتر تھی۔ ان میں کرائے کے سپاہی، سرکاری ملازم، تاجر اور دیگر پیشوں سے وابستہ لوگ بھی شامل تھے۔[14]

بائیبل میں لکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ سے یہ وصیت کی کہ ان کے بیٹے کی شادی کنعانیوں میں نہیں ہونی چاہیے، بلکہ ان کے آبائی وطن سے ہونی چاہیے،[15] یہ جملہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل کنعان کی قدیم نسل سے بالکل مختلف تھی۔
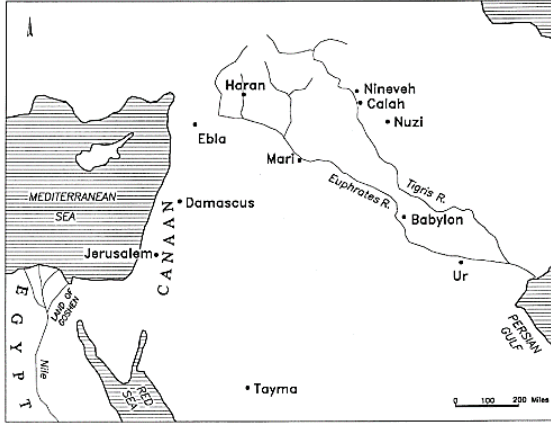
بین النہرین اور کنعان۔۔۔نقشے میں واضح اُر(Ur) کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اثری شواہد میں اسمِ ابراہیم علیہ السلام

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا نام بائبل کے مطابق "ابرام" تھا یعنی "عظیم المرتبہ والد"۔ خدا سے میثاق کے بعد آپ کا نام ابراہم (ابراہیم) ہوا جس کے معنی قوموں کے باپ کے ہیں۔ ابراہم یا عربی میں ابراہیم ہی آپ کا مشہور و معروف نام ہے۔ لفظ ابراہیم کو اکثر علماء نے عجمی یعنی غیر عربی قرار دیا ہے۔[16] یہی نام آپ کا مشہور و معروف ہے۔ ابن خلدون بھی بیان کرتے ہیں کہ ابن عابر اور ابراہیم علیہ السلام کے اجداد عربی سے ناواقف تھے اور عجمی زبان بولتے تھے۔[17] یہ لفظ دراصل بابلی زبان سے ہے۔ بابلی زبان میں اَب کے معنی باپ ہے چنانچہ اس زمانے میں چاند دیوتا سین کو بھی اَب کہا جاتا تھا۔[18] بابلی تہذیب میں ہمیں یہ نام ایک قدیم دستاویز میں Abarama کی صورت میں ملتا ہے۔[19] جس کے معنی حقیقی باپ یعنی خدا سے محبت کرنے والا ہے۔[20] اسی طرح آپ کی زوجہ سارہ کا نام بھی اصلا Sarratu ہو سکتا ہے جو بابلی دیوتا سین کی ملکہ کا نام بھی تھا۔ ابراہم اور اس سے ملتے جلتے مختلف مشتقات مثلاً ابورہانا، ابورام، ایبرم، وغیرہ کثرت سے مختلف بستیوں مثلاً ایبلہ، سائپرس، مصر، دیلبت، اگریٹ، ماری اور دیگر علاقوں سے ملنے والے دستاویز میں موجود ہیں۔ ان کے بارے میں مشرق وسطیٰ کے مستند ترین مورخ

پروفیسر گوستا کہتے ہیں کہ "یہ حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ مغربی سامیوں میں ابرام غیر معروف نام نہیں تھا۔"[21]

آپ علیہ السلام کا زمانہ؛ تاریخ اثری شواہد کی روشنی میں

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا زمانے کا تعین کرنا انتہائی مشکل ہے۔ مورخین بالعموم 2200 سے 2000 قبل مسیح کے درمیان بتاتے ہیں۔ بائیبل میں پیغمبروں کی عمر کا حساب دیکھیں تو ان کی روشنی میں تاریخ کے ماہرین کی رائے 2200 سے 2300 قبل مسیح یعنی ابتدائی دھاتی عہد (Early Bronze Age) بنتی ہے لیکن یہ تاریخ بائیبل میں بیان کردہ زندگی کے مبالغہ آمیز مدت پر مبنی ہے اس لیے اس پر اعتماد کرنا خاصا مشکل ہے۔ مثلاً بائیبل کے مطابق جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا انتقال ہوا تو ان کی عمر 175 تھی، یہ عمر ہم ایک دو شخصیات کے بارے میں استثنائی طور پر تسلیم کرسکتے ہیں لیکن اکثر اہم شخصیات کے متعلق اس قدر طویل عمر خیال کرنا مغالطہ کے سوا کچھ نہیں۔2200 سے قبل کا عہد اس لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ جو حالات وواقعات اور شواہد ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کیے گئے، اثری شواہد سے ملنے والی تمام تر معلومات ان سے متصادم ہیں۔ مثلاً ہم یہاں تین بنیادی نکات بیان کریں گے: جن کی روشنی میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیم کا عہد 1900 قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ہے، بلکہ آپ کا زمانہ 1900 سے 1700 قبل مسیح کے درمیان میں ہے۔اس کے لیے ہمارے پاس مندرجہ بنیادی شواہد موجود ہیں۔

ا۔ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سے متعلق جن شہروں کا نام ہمیں صحائف میں ملتا ہے، مثلاً حبرون، بئیر السبع وغیرہ، ان شہروں کا وجود 1900 قبل مسیح سے پہلے نہیں تھا۔ بائیبل[22] میں یروشلم کے بادشاہ ملک صدق کا ذکر ہے، جبکہ آرکیالوجی کی روشنی میں یہ بات حتمی ہے کہ 1800 قبل مسیح سے پہلے یروشلم میں کسی متمدن آبادی کا وجود نہیں تھا۔[23] یہ تمام شہر 1800 قبل مسیح کے بعد تعمیر ہوئے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہر پروفیسر Israel Finkelstein لکھتے ہیں:

Important biblical sites that are mentioned in the Abraham stories, such as Shechem, Beer-Sheba, and Hebron, did not yield finds from the Intermediate Bronze Age (IBA). These sites were simply not inhabited at that time."[24]

"بائبل کے اہم مقامات جن کا تذکرہ ابراہیم کی کہانیوں میں کیا گیا ہے، جیسے سکم، بیئر السبع اور حبرون، ان شہروں میں کانسی کے درمیانی عہد کا کوئی ثبوت میسر نہیں ہے۔ اس وقت یہ جگہیں بالکل آباد نہیں تھیں۔"

۳۔ بائیبل کتابِ پیدائش میں سیدنا ابراہیم اور لوط علیہما السلام کے زمانے میں مشرقِ وسطیٰ کے کئی بادشاہوں کے باہم جنگی اتحاد کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ اتحاد تاریخ میں واضح طور پر 1900 قبل مسیح کے بعد ہی ملتا ہے کیونکہ اس سے قبل نہ ہی ان تمام ریاستوں کا وجود تھا اور نہ ہی ان میں کوئی اتحاد کا ثبوت ملتا ہے۔

۴۔ قرآن مجید اور بائیبل کے مطابق لوط علیہ السلام آپ کے بھتیجے تھے اور آپ کے ساتھ کئی سفر بھی کیے تھے۔ ان کی بعثت بحیرہ مردار کے اس مقام پر ہوئی تھی جہاں اُس زمانے میں خشک زمین تھی۔ قرآن کے مطابق اس قوم پر آسمان سے پتھر کی بارش کی اور پورا علاقہ نیست و نابود ہو گیا۔[25] جدید ارضیاتی سائنس کے مطابق اس علاقے کی تباہی لگ بھگ 1800 سے 1700 قبل مسیح کے درمیان ہوئی۔[26]

۵۔ قرآن اور بائیبل سے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ آپ نے عارضی طور پر کنعان سے مصر کی طرف ہجرت کی تھی۔ لیکن 1970 قبل مسیح سے پہلے کنعان سے مصر کی جانب ہجرت کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ جبکہ اس زمانے کے بعد ہمیں مستقل طور پر ایسے آثار ملتے ہیں جن میں کنعان اور مصر کے درمیان ہجرت کا ذکر ہے۔ فلس سریتا اپنی کتاب Asiatics in middle kingdom Egypt میں ایک کتبے یا قرطاس کا ذکر کرتے ہیں جس میں قحط سے متاثر انتہائی کمزور مرد

اور عورتوں کا گروہ ہے جو صحرا میں خوراک کی تلاش میں مصر کی طرف آرہے ہیں۔[27] یہ غالباً Brooklyn Papyrus کا تذکرہ ہے ہے جس کا زمانہ 1700 سے 1800 قبل مسیح کے لگ بھگ ہے۔ان قرائن کی روشنی میں یہ بات بہتر معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ کم از کم 2000 قبل مسیح کے بعد اور 1750 سے پہلے کا تھا۔

اُر شہر کا صحیح مقام

بائیبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش کلدانیوں کا شہر اُر (Ur) بتائی گئی ہے۔ مورخین کی اکثریت کے مطابق یہ شہر جنوبی بین النہرین میں واقع ہے۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ قدیم کتبات بالخصوص ابیلا کے کتبات میں اس نام سے بہت سے شہر اس خطے میں ملتے ہیں۔ بائیبل کی وہ عبارت جو اس شہر کی طرف اشارہ کرتی ہے، جن سیاق و سباق میں آئی ہے، وہاں یہ لازم نہیں لفظِ اُر بطور اسم عَلَم کے معنی میں ہی کہا گیا ہے بلکہ یہاں اُر سے مراد آگ بھی ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مورخین کے ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جن کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کا اُر جنوبی بین النہرین کے بجائے کہیں اور بالخصوص شمالی خطے میں تھا۔ماضی میں اکثر یہودی علمانے بھی یہی رائے اختیار کی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام شمالی بین النہرین میں پیدا ہوئے تھے۔ اس حوالے سے کچھ باتیں قابل غور ہیں۔

ا۔ ابراہیم علیہ السلام سے یعقوب علیہ السلام تک تمام عبرانی پیغمبروں کا حاران کا عمومی سفر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُر اور حاران میں نسبتاً کم فاصلہ تھا۔

۲۔ بائیبل کے مطابق ابراہیم کنعان کی جانب ہجرت کرتے ہوئے اپنے والد تارح کے ہمراہ (موجودہ ترکی میں واقع) حاران بھی گئے جہاں تارح کی وفات ہوئی،[28] یعنی اُر سے کنعان جاتے ہوئے حاران راستے میں کہیں واقع تھا۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کا اُر جنوب کے بجائے شمال یا وسط میں ہونا چاہیے

کیونکہ جنوبی بین النہرین کے اُر کو تسلیم کرنے میں سب سے اہم اعتراض یہی واقع ہوتا ہے کہ دونوں علاقے ایک دوسرے سے انتہائی دور اور مختلف سمت میں واقع ہیں۔ یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ جنوبی بین النہرین سے کنعان جانے کے لیے حاران کا راستہ اختیار کیا جائے۔
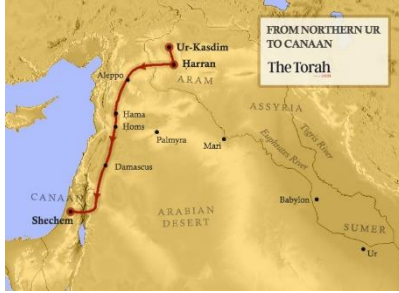
ترکی میں واقع حاران اور اُر۔۔ ابراہیمؑ کی ہجرت کا راستہ بھی واضح ہے۔

۳۔ بائبل میں شہر ابراہیمی کے لیے "کلدانی اُر" (Ur of Chaldeans) کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ کلدانی تہذیب بین النہرین کے شمال اور وسط میں ہی پھیلی ہے اور جنوبی اُر اس تہذیب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

۴۔ بائبل میں پیغمبر یوشع کہتے ہیں کہ "میں وہ کہہ رہا ہوں جو خداوند اسرائیل کا خدا تم سے کہتا ہے: بہت زمانہ پہلے تمہارے باپ دادا دریائے فرات کے دوسری جانب رہتے تھے۔"[29] اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کا خاندان دریائے فرات کے بالائی علاقوں میں یعنی شمالی بین النہرین میں رہتا تھا۔ یہ یاد رہے کہ تاریخ کے مطابق یہ وہی خطہ ہے جہاں عموری گروہ آباد تھا۔

۵۔ ابراہیم علیہ السلام کا بارہا حاران جانا، اسحاقؑ کے لیے کنعانیوں میں شادی سے منع کرتے ہوئے حاران جانے کی تاکید کرنا اسی طرح سیدنا اسحاق کی جانب سے بھی اپنے بیٹے یعقوب علیہما السلام کو اپنی قوم میں شادی کے لیے حاران بھیجنا[30]، یہ شہادتیں اس بات کے لیے کافی ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے

اجداد کی آبادی ابتدائی طور پر حاران میں تھی اور پھر یہ گروہ عموریوں کے ہمراہ شمالی بین النہرین میں واقع اُر کی طرف گیا، جہاں ابراہیم پیدا ہوئے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات زیادہ راجح لگتی ہے کہ آپ علیہ السلام شمالی بین النہرین یعنی موجودی ترکی کے سرحدی علاقے میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ آپ علیہ السلام کا شہر اُر اس مقام پر تھا جہاں آج ترکی کا شہر عُرفہ موجود ہے جسے Sanliurfa بھی کہتے ہیں۔ یہ شہر بالکل حاران کے ساتھ ہی واقع ہے اور قدیم زمانے سے ہی اس راستے عموری گروہ کنعان میں آباد ہو رہا تھا۔

آتشِ نمرود کا واقعہ اور اثری شواہد

بابلی تالمود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش کوثیٰ بتائی گئی ہے۔[31] مسلم لٹریچر مثلاً حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں پیدا ہوئے اور کوثا میں ایک مقام پر آگ میں ڈالا گیا۔[32] یہ مقام کون سا تھا؟ اس بارے میں مشرق وسطیٰ کی تاریخ اور زبانوں کے مشہور عالم و مورخ 'گائے لے سٹرینج" (d.1933) اپنی شہرہ آفاق کتاب" The Lands of the Eastern Caliphat "میں حوالہ دیتے ہیں کہ دسویں صدی میں بالائی بین النہرین میں پیدا ہونے والے مشہور مسلمان جغرافیہ دان، سیاح اور مصنف ابن حوقل نے یہاں راکھ کے قدیم ٹیلے دیکھے جہاں آگ میں جلانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔[33] یہ راکھ اس کے مطابق اسی جائے وقوعہ کی تھی جہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کی جسارت کی گئی تھی۔ اس مقام کو آج بھی تل ابراہیم (Tell Abraham) کہا جاتا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ نکتہ ہمیں تاریخ اور بائیبل سے ملتا ہے۔ بائیبل تصدیق کرتی ہے کوثا کے رہنے والوں نے نیرگل کو اپنا دیوتا بنا لیا تھا۔[34] یہ بین النہرین میں وہ واحد دیوتا ہے جس کا تعلق براہ راست آگ سے ہے۔ اسی نیرگل کا ایک اور لقب "شرپّو" (Shuruppu) تھا جس کے معنی ہیں جلانے

والا۔ آثار قدیمہ سے یہ بات ثابت ہے کہ نیرگل دیوتا اور اس کے پجاریوں کا مرکز کوثا ہی تھا۔[35] 3000 قبل مسیح کے بعد بطور دیوتا اس کی پرستش سمیری قوم میں عام ہوئی۔ چنانچہ کوئی بعید نہیں ہے کہ اسی نیرگل کے پجاریوں نے ہی ابراہیم علیہ السلام سے مقابلہ کیا ہو۔ اسی طرح کا ایک دعویٰ ترکی کے شمالی عرفہ کے ایک علاقے کے بارے میں بھی کیا جاتا ہے جہاں مسجدِ ابراہیم واقع ہے۔ لیکن یہاں سے کسی بھی قسم کے آثار ملنا ممکن نہیں کیونکہ موجودہ دور میں اس علاقے پر ایک وسیع و عریض جدید شہر تعمیر ہو چکا ہے اس لیے وہاں کھدائی کر کے مزید کچھ دریافت کرنا محال ہے۔ اگر کوئی ثبوت موجود بھی ہو گا تو آج وہ ہزاروں من مٹی اور کنکریٹ کے بوجھ میں پوشیدہ ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد نے انھیں دھمکی دی کہ اگر وہ بتوں کی توہین سے نہ رکیں تو انھیں سنگسار کر دیا جائے گا۔[36] پورے بین النہرین میں صرف Lagash وہ واحد مقام ہے جس کے حاکم کی جانب سے 2400 قبل مسیح کے اوروکاجینا (Urukagina) قانون میں سنگساری کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ قریبی علاقے Lagash میں قبروں سے ایسی لاشیں دریافت ہوئی ہیں جنھیں جلایا گیا ہے۔[37] بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ مردوں کو جلانے کی رسم (Cremation) کی وجہ سے ہے، لیکن مورخین کی اکثریت اس بات کو اصولی طور پر تسلیم کرتی ہے کہ بین النہرین میں مردوں کو جلانے کا کوئی رواج نہیں تھا کیونکہ وہاں لکڑی بھی عام دستیاب نہیں تھی۔ یہ واقعہ صرف انھی علاقوں میں ہی کہیں ہو سکتا ہے۔ یہ شہر جنوب لیکن فرات کے بالائی علاقے میں ہے۔ ایک اور ثبوت بابلی سلاطین کی فہرست سے متعلق ایک قدیم (Tablet) ہے جو اس وقت برٹش میوزم میں ہے۔ اس فہرست میں لکھا ہے کہ بادشاہ Simmas-sihu کو جلایا گیا تھا۔[38] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابلی تہذیب کے ابتدائی دور میں جلانے کا رسم کسی نہ کسی سطح پر موجود تھی۔

ان سبھی تاریخی حوالوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش بین النہرین کے جنوب میں ہی ہوئی تھی، اور یہیں آپ کا آبائی وطن تھا لیکن بعد ازاں وہ اپنے خاندان سمیت بین النہرین کے وسطی علاقوں میں ہجرت کر گئے، اسی وجہ سے ان کی ہجرت حاران میں باسانی ہوتی رہی۔ جو ماحول ہمیں ابراہیمی داستانوں میں ملتا ہے وہ بین النہرین کے شمال اور وسطی علاقوں میں پھلنے والی تہذیب سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔

تاریخ میں نمرود کا ذکر

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح یا قرآن مجید کے مطابق آذر تھا۔ آذر یا یہودی روایات کے مطابق تارح پیشے کے اعتبار سے مجسمہ ساز اور اسی کا بیوپاری تھا۔[39] حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ السلام جوان ہوئے تو آپ نے اپنی قوم کو بت پرستی اور شیطان کی پرستش چھوڑنے کی دعوت دی اور ایک روز رات کی تاریکی میں عبادت گاہوں میں جا کر سارے بت توڑ دیے۔

بت شکنی کے واقعے کے بعد تارح نے انھیں بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ اور اسی نے آپ علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کی جسارت کی۔ بائیبل اور تالمود میں اس بادشاہ کا نام نِمرود بتایا گیا ہے۔ مسلم مفسرین اور مورخین نے بھی اسے نمرود ہی کہا ہے۔ لیکن قرآن کے متن میں اس بادشاہ کا نام کہیں نہیں بتایا گیا۔ دلچسپ بات ہے کہ بین النہرین سے اس بادشاہ کا کوئی ریکارڈ نہیں ملا ہے، بادشاہوں کی جو فہرست بین النہرین سے دستیاب ہوئی ہیں ان میں نمرود نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ نمرود اصل میں اُرنمو کی بگڑی ہوئی صورت ہے جو بین النہرین میں ایک بادشاہ گزرا ہے۔ اس کا دورِ حکومت 2113 قبل مسیح سے 2046 تھا۔[40] اُر کی تیسری سمیری سلطنت کا موسس تھا اور اپنے دور میں اس کی حکومت انتہائی محدود تھی۔ اُرنمو کے بارے میں قدیم کتبات میں حالات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مگر اس سے منسوب ہمیں ایک قانونی دستور ملتا ہے جس میں

ارنمو نے اپنی سلطنت کے لیے کئی عمدہ قانونی شق متعارف کروائی تھیں۔ اگر اس دستور کی نسبت اُرنمو کی جانب درست ہے تو یہ اس کے فلاحی کارناموں کے پیش نظر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ارنمو ہی نمرود تھا۔ البتہ یہ بھی ممکن ہے ارنمو کے بعد اس کی اولاد میں سے ابی سین (Ibbi-Sin) ابراہیم علیہ السلام کے مقابل ہو کیونکہ اس نے عموری گروہ کے خلاف کئی کاروائیاں بھی کی تھیں۔ یہ سمیری سلطنت کا آخری بادشاہ تھا جس کا زمانہ 2028 قبل مسیح سے 1940 قبل مسیح کے درمیان متعین کیا جاتا ہے۔

تیرہویں صدی قبل مسیح کے ایک بادشاہ شل منصر اوّل نے شمالی عراق میں ایک شہر بسایا تھا اور یہاں عظیم الشان محل بھی تعمیر کیا۔ اس شہر کو نمرود کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ یہ شہر نمرود نے تعمیر کیا تھا، جبکہ امکان صرف اس بات کا ہے کہ اس بادشاہ کے کسی جانشین یا پیروکار نے اس شہر کو نمرود (Nimrud) کا نام دیا۔

ہمارے خیال میں نمرود نام سے کوئی بھی بادشاہ بین النہرین میں نہیں ہے لیکن یہ لفظ نمرود اصل میں نی-مرد ہے۔ نی کے معنی مالک اور بادشاہ کے ہیں جبکہ مرَد اس تہذیب کے قدیم شہر کا نام ہے جو کوثا کے قریب ہی واقع ہے۔ یعنی آپ علیہ السلام کا یہ واقعہ قدیم شہر "مرَد" سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے بادشاہ کو "نی مرَد" یا نمرود کہا گیا ہے۔

کنعان اور مصر کی جانب ہجرت

پھر ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: میں (ہجرت کر کے) اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں وہ مجھے ضرور راستہ دکھائے گا (وہ ملکِ شام) کی طرف ہجرت فرما گئے۔[41]

بائبل میں ہے:

خداوند نے ابرام سے کہا، " تو اپنے ملک اور اپنے لوگوں کو چھوڑ کر چلا جا۔ " تو اپنے باپ کے خاندان کو چھوڑ کر۔ اس ملک کو چلا جا جسے میں دکھاؤں گا۔ میں تجھے خیر و برکت عطا

کروں گا۔ اور تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر تیرے نام کو خوب شہرت دوں گا۔ لوگ تیرے نام کا استعمال دوسرے لوگوں کو دُعا دینے کے لئے کریں گے۔[42]

قرآنی آیات میں مذکور ہے کہ ان کی قوم آپ علیہ السلام پر ایمان نہ لائی تو اللہ نے سیدنا ابراہیم اور لوط علیہما السلام کو ایک خاص بابرکت سرزمین کی جانب ہجرت کا حکم دیا۔ اس بابرکت (Blessed) سرزمین کے تعین کے بارے میں قرآن اور صحیح احادیث خاموش ہیں، تاہم اسرائیلی روایات اور عرب کی متواتر تاریخ سے یہی اخذ کیا جاتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے اس علاقے کی جانب ہجرت کی جو موجودہ مقبوضہ فلسطین (اسرائیل) کا جنوبی علاقہ ہے۔ یہاں آپ اپنے خاندان سمیت آباد ہوئے۔

بائیبل میں اس امر کی صراحت ہے کہ آپ علیہ السلام پہلے تین برس تک حاران میں ہی رہے جہاں کے آپ کے بہت سے رشتہ دار موجود تھے۔ قرآن مجید کے مطابق ان کے والد تاحال ان پر ایمان نہیں لائے تھے۔[43] اسی دوران آپ کا نکاح سارہ سے ہوا اور پھر آپ کو خدا کا حکم ملا کہ کنعان کی طرف ہجرت کریں چنانچہ آپ رختِ سفر باندھ کر اپنے خاندان اور حضرت لوط کے ہمراہ کنعان آگئے۔[44] البتہ آپ کے والدین تاحیات یہیں حاران میں مقیم رہے اور تالمود شہادت دیتی ہے کہ آپ بعد ازاں ان سے ملاقات کے لیے دوبار حاران تشریف لائے اور پانچ سال قیام کیا مگر دوبارہ کنعان لوٹ آئے۔

اسی اثنا میں کنعان میں قحط سالی ہوئی جس کی وجہ سے آپ کو اپنی زوجہ سارہ اور بھتیجے لوط (علیہما السلام) کے ساتھ عارضی طور پر مصر کی طرف جانا پڑا۔ غالباً اس کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ سامی اقوام مصر کے سرحدی علاقوں میں آباد تھی جس کا ذکر ہمیں اس زمانے کے مصر کے اثری شواہد میں بجا طور پر ملتا ہے۔ مثلاً بنی حسن کے قدیم مقبروں میں منقش فن پاروں میں 37 ایشیائی افراد کی عکاسی کی گئی ہے جو کنعان سے مصر میں ہجرت کرکے آرہے ہیں یہ فن پارے 1890 قبل مسیح کے ہیں۔[45] اسی طرح قدیم مصری

داستان سنوحی (Sinuhe) میں بھی سے کنعان سے مصر کی جانب ہجرت کا تذکرہ ہے جس کا زمانہ 1900 قبل مسیح ہے۔ اسی زمانے میں نفرتی کی پیشن گوئی (The Prophecy of Neferti) میں بھی Amenemhet I (1975-1946BC) سے منقول بیان میں ایشائی مہاجرین کا ذکر ہے، گو کہ یہ تاریخی ریکارڈ کے بجائے پیشن گوئی ہے لیکن اس سے ہمیں اتنا سراغ ضرور ملتا ہے کہ اس زمانے میں یہ بادشاہ کنعان سے مہاجرین کی آمد کے حوالے سے متفکر تھا۔[46]

مصر اُس زمانے میں فراعین کے زیرِ تسلط تھا اور اہرام مصر کی تعمیر ہوئے بھی 500 برس لگ بھگ گزر چکے تھے۔ بائیبل اس موقع پر یہ واقعہ بیان کرتی ہے کہ مصر میں اس وقت کا فرعون بہت ہی عیاش اور حسن پرست تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کی بہت سی خوبصورت عورتیں اپنے پاس جمع کر رکھی تھیں۔ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ سارہ کے ہمراہ مصر گئے تو انھیں یہ خوف لاحق ہوا کہ فرعونِ مصر حضرت سارہ کو حاصل کرنے کے لیے مجھے قتل کر دے گا، چنانچہ وہ اپنی زوجہ سے کہتے ہیں کہ جب مصری تمھیں پکڑیں تو تم مجھے اپنا بھائی بتانا اور میں بھی تمہیں اپنی بہن بتاؤں گا تاکہ وہ قتل نہ کریں۔[47] بعد ازاں وہ بادشاہ آپ کے اخلاق کریمہ سے متاثر ہو کر تائب ہو گیا اور اپنی بیٹی ہاجرہ کو آپ کی زوجیت میں دے دیا۔ اس امر کی نشاندہی کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ بائیبل کے مطابق اس واقعے کے وقت حضرت سارہ کی عمر 70 برس تھیں۔ 70 برس کی خاتون کے بارے میں یہ خدشہ رکھنا یقینا خلافِ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔

مورخ ابن خلدون نے طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس فرعون نے سارہؑ کا ارادہ کیا تھا وہ سنان بن علوان تھا۔[48] اس فرعون کے بارے میں مصری تاریخ میں کوئی خاص پتہ نہیں ملتا، البتہ 1802 میں دریافت ہونے والے ایک پارچہ تورین (Turin King List) میں ایک فرعون کا ادھورا

نام سینن (Senen) لکھا ہے۔ یہ پارچہ انتہائی بوسیدہ اور ادھورا ہے اور اس میں مذکور بادشاہوں کی تفصیل بھی تاریخ میں ناپید ہے۔[49]لیکن یہ نام طبری کی روایت سے ملتا جلتا ہے۔

خلاصہ کلام

مقالہ ہذا میں پیش کیے گئے مختلف شواہد سے یہ بات پیش کی گئی ہے کہ قرآن اور بائبل میں جو قرائن ابراہیم علیہ السلام کے حالات اور ان کی معاشرت کے بارے میں بیان کیے گئے ہیں، ان کی تصدیق آثار و شواہد سے مکمل طور پر ہوتی ہے۔ نیز وہ کردار جو ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، بین النہرین کی مستند تاریخ کا حصہ ہیں، حتیٰ کہ آپ علیہ السلام کا نام کی شہادتیں بھی اثری شواہد سے مل چکی ہیں جن کے شواہد ہم نے مقالے میں پیش کیے ہیں۔ چنانچہ تین بڑے مذاہب کے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کوئی فرضی کردار نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک روشن اور حقیقی شخصیت ہیں۔

تجاویز

۱۔ اس مقالے میں تحقیق کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سماجی پس منظر تک محدود رکھا گیا ہے ، تاہم محققین کے لیے اس موضوع پر مزید کام کرنے کا راہیں موجود ہی۔ بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر قدیم کتبات میں موجود ہے۔ اس پر تحقیق کی جانی چاہیے۔

۲۔ بالعموم انبیائے کرام کی تاریخ کے لیے ہمیں بائبل اور دیگر سامی صحائف کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بائبل کی تدوین و ترتیب بہت بعد میں ہوئی ہے اور اس میں تحریف بھی ایک علمی حقیقت ہے؛ لہٰذا اسرائیلی روایات سے ہم مجموعی منظر کو سمجھنے میں مدد تو لے سکتے ہیں لیکن ہم انھیں بنیاد نہیں بنا سکتے۔ تاریخ کے تعین کے لیے انھی قرائن کو بنیاد بنانا چاہیے جو مستند ذرائع سے ہم تک پہنچے ہوں۔

۳۔ قرآن کے حوالے سے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید تاریخ سے متعلق کوئی تفصیلی کتاب نہیں ہے اس لیے اس کتاب میں پیغمبروں کے واقعات اسی قدر بیان کیے گئے ہیں جو ہماری نصیحت اور ہدایت کے لیے ہیں۔ البتہ ان واقعات میں بہت سے مقامات پر کچھ قرائن موجود ہیں جنھیں سامنے رکھتے ہوئے آثار قدیمہ میں انھیں تلاش کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۴۔ مشرقِ وسطیٰ میں آثار قدیمہ کو ابھی ڈیڑھ سو برس ہی گزرے ہیں اور روز بروز نئی دریافت سامنے آرہی ہیں جبکہ ماضی کے ہزاروں سربستہ راز اب بھی منوں مٹی تلے دفن ہیں۔ اگر کسی شخصیت یا واقعے کے بارے میں کوئی تاریخی ریکارڈ ہمیں فی الحال میسر نہیں ہے تو ہم اس کا مکمل انکار نہیں کرسکتے۔ بلکہ ہمیں اس کے لیے تحمل سے کام لیتے ہوئے انتظار کرنا چاہیے کہ مزید شواہد ہمارے سامنے آتے رہیں۔

۵۔ ہمارے ہاں بالعموم اردو کتب میں جدید تحقیقات سے استفادے کا رجحان انتہائی مفقود ہے۔ اکثر کتب میں جن جدید تحقیقات کا حوالہ ہوتا ہے وہ بھی کم از کم 1960 سے پہلے کی ہیں، ظاہر ہے کہ اس زمانے کے بعد بھی بے تحاشا شواہد مزید دریافت ہوئے ہیں جن سے نتائج بہت زیادہ بدل چکے ہیں۔ چنانچہ ایک محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ بارہا نئی تحقیقات کا جائزہ لیتے رہے اور اپنی تحقیق کو Upto date رکھے۔

٦۔ آثارِ قدیمہ سے دریافت ہونے والے شواہد کا زمانۂ تاریخ کاربن ڈیٹنگ کے ذریعے متعین کیا جاتا ہے۔ یہ اہم ذریعہ ہے جو آثار قدیمہ کے ماہرین پودوں اور نامیاتی مواد سے بنی اشیاء کی عمر کا تعین کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سائنسی نعمت کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ کاربن ڈیٹنگ کے ذریعے جو تاریخ متعین کی جاتی ہے وہ بالکل حتمی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں 100 سے 200 برس کا فرق واقع ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں جن بنیادوں پر عمر کو پرکھا جاتا ہے اس پر مختلف ماحول جدا جدا طریقے میں اثرانداز ہوتے ہے۔ کارنیل یونیورسٹی کے پروفیسر مینگ (Strut W. Manning) نے ایک تفصیلی

مقالہ[50] لکھا ہے جس میں انھوں نے یہ بتایا کہ کس طرح کاربن ڈیٹنگ کے نتائج مختلف حالات میں مختلف ملتے ہیں، وہ مزید کہتے ہیں کہ ہمیں مشرق وسطیٰ کی ابتدائی تاریخ پر نظر ثانی کا ایک نیا دور شروع کرنا چاہیے۔"[51] اسی طرح نیشنل جیو گرافک میں شایع ایک مضمون میں بھی یہ وضاحت موجود ہے کہ کاربن ڈیٹنگ بالکل حتمی نہیں ہے۔[52] لیکن اس اعتراف کے باوجود بہت سے مورخین کا اس حوالے سے بے جا اصرار تاریخ کو غلط سمت میں لے جاتا ہے۔ لہٰذا ایک صداقت پسند مورخ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کسی بھی کاربن ڈیٹنگ کو حتمی سمجھتے ہوئے اس سے یقینی نتائج نکالنے کے بجائے کچھ لچک رکھی جائے اور دیگر قرائن کی روشنی میں تاریخ متعین کی جائے۔

یہ وہ تجاویز اور نکات ہیں جنھیں پیش نظر رکھا جائے تو ہم موجودہ اثری شواہد میں دیگر انبیا کرام علیہم السلام کی شخصیت کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

---

[1] سورۃالنساء:125

Surh Al-Nisa:125.

[2] شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص:29

Shah Waliullah, Alfoz-ul-kabir fe Asol Al-Tafseer, P:29.

[3] سورۃالنمل:69

Surh Namal:69.

[4] عبد الماجد دریا آبادی، تفسیر ماجدی، مجلس نشریات اسلام ص:137

Abdul majid dariya Abadi, Tafseer Majdi, Majlis Nashriyat Islam, P:137.

[5] سید سلیمان ندوی، تاریخ ارض القرآن، جلد دوم، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، صفحہ 32

Syed Suleman Nadvi, Tareekh Arddul Qura'an, Vol:2, Darul mosannifin, Azam Ghar, P:32.

[6] John Van Seters, *Abraham in History and Tradition*, Echo Point Books and Media, 2014, p.309

[7] William G Dever, *What Did the Biblical Writers Know and When Did They Know it?* Wm. B. Eerdmans Publishing, 2001 p.98

[88] کتابِ پیدائش۔12:7، 21:10، 11:11

Kitab-e-Pedaish, 12:7,21:10,11:11.

[9] کتاب استثناء، باب26، فقرہ5

Kitab e Istisna, Bab:26, Verse: 5.

[1010] دکتور شوقی ابو خلیل، اطلسُ القرآن، مترجم: حافظ محمد امین، توضیح واضافہ: محسن فارانی، دارالسلام، صفحہ 76، ۱۴۲۴ھ

Dr. Shoqi Abu Khalil, Atlas-ul-Qura'an, Mutarajjam: Hafiz Muhammad Amin, Dar-ul-Salam, P:76,1424H.

[11] بائیبل، کتاب پیدائش، باب24، فقرہ4-3

Baibal, Kitab e Pedaish, Bab:24,Verse:3-4.

[12] سینویس، **تاریخ اقوامِ عالم قدیم**، ترجمہ فارسی: مرزا محمد علی خان ذکا الملک۔ مترجم اردو: سید محمود اعظم فہمی، صفحہ 191۔ بُک فورٹ پبلی کیشنز، لاہور(2017)

Senwes, Tareekh Aqwam-e-Aalam Qadeem, Tarjuma Farsi: Mirza Muhammad Ali Khan Zaka Al-mulk, Mutarajam: Syed Mehmood Azam Fehmi, P:191, Book fort Publications , Lahore (2017).

[13] ایضاً، ص:192

Ibid, P:192.

[14] عماد الحسن فاروقی۔ دنیا کے بڑے مذاہب۔ صفحہ 237۔ مکتبہ تعمیر انسانیت۔ لاہور(1990)

Emad-ul-Hasan Farooqi, Duniya Ky Bary Mazahib, P:237, Maktaba Tameer-e-Insaniat, Lahore(1990).

[15] بائیبل، کتاب پیدائش، باب24، فقرہ4-3

Baibal, Kitab-e-Pedaish, Bab:24,Verse:3-4.

[16] اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ۔ جلد1۔ صفحہ 345۔ زیر اہتمام دانش گاہِ پنجاب، لاہور(1980)

Urdu Daira Ma'arif Islmia, Vol:1,P:345, Zer-e-ehtimam Danish gah Punjab, Lahore(1980).

[17] تاریخ ابن خلدون، صفحہ 48، نفیس اکیڈمی، اردو بازار کراچی

Tareekh Ibn Khaldoon, P:48, Nafees Academy, Urdu Bazar, Karachi.

[18] Journal of Biblical Literature, XXVIIL, p. 166, n.

[19] Proceedings, American Philosophical Society (vol. 52, 1913), American Philosophical Society, page 196

[20] Proceedings of the Society of Biblical Archaeology, Volume 37, The Society London, 1915 page 178

[21] Gosta Ahistrom, The History of Ancient Palastine, Fortress Press, 1994, p.181

[22] کتابِ پیدائش، باب14۔ فقرہ18

Kitab-e-Pedaish, Bab:14,Verse:18.

[23] Jane M. Cahill and David Tarler, "Excavations Directed by Yigal Shiloh at the City of David, 1978– 1985," in Ancient Jerusalem

Revealed, ed. Hillel Geva (Jerusalem: Israel Exploration Society, 1994), 32. Israel Finkelstein, "The Central Hill Country in the Intermediate Bronze Age," Israel Exploration Journal 41, no. 1-3 (1991), 21-29

[24] Israel Finkelstein, "Patriarchs, Exodus, Conquest: Fact or Fiction?" in The Quest for the Historical Israel: Debating Archaeology and the History of Early Israel, SBL Archaeology and Biblical Studies, ed. Brian B. Schmidt (Atlanta, GA: Society of Biblical Literature, 2007), 44.

[25] سورۃ الاعراف۔ آیت84

[26] Bunch, T.E., LeCompte, M.A., Adedeji, A.V. et al. A Tunguska sized airburst destroyed Tall el-Hammam a Middle Bronze Age city in the Jordan Valley near the Dead Sea. Sci Rep 11, 18632 (2021). https://doi.org/10.1038/s41598-021-97778-3

[27] Phyllis Saretta, Asiatics in Middle Kingdom Egypt: Perceptions and Reality, Bloomsbury Academic, 2017, page 57-58

[28] بائبل۔کتاب پیدائش۔باب12

Baibal, Kitab-e-Pedaish, Bab:12.

[29] کتاب یوشع،باب24فقرہ3

Kitab-e-Yusa, Bab:24,Verse:3.

[30] بائبل۔کتاب پیدائش۔باب28

Baibal, Kitab-e-Pedaish, Bab:2.

[31] The Babylonian Talmid, Sefaria, Baba Batra, 91.1
https://www.sefaria.org/Bava_Batra.91a.16?lang=bi&with=Commentary&lang2=en Wednesday, November 9, 2022

[32] اٹلس فتوحات اسلامیہ،احمد عادل کمال،صفحہ107،دارالسلام الریاض

[33] Guy le Strange, The Lands of the Eastern Caliphate, Cosimo, Inc., 2010, pg 68

[34] Myths from Mesopotamia: Creation, The Flood, Gilgamesh, and Others, translation & edited by Stephanie Dalley, Oxford University Press, 2000, pg 161

[35] Myths from Mesopotamia: Creation, The Flood, Gilgamesh, and Others, translation & edited by Stephanie Dalley, Oxford University Press, 2000, pg 161

[36] سورۃ مریم،آیت46

Surh Maryam:46.

[37] Percy Stuart Peache Handcock, Mesopotamian Archaeology, 1912, PAGE 62

[38] The Babylonian and Oriental Record, Volume 1, D. Nutt, 1887, Princeton University

[39] Midrash Rabbah: H. Freedman and M, Simon , editors M idrash Rabbah , Translated in English with Notes, Glossary and Indices, Vol II , Soncino Press, London, 1961 , pg 310, Chapter XXXVIII , Verse 13

[40] گمشدہ تہذیبوں کی داستان۔ ترجمہ محمد یحیٰ خان۔ مضمون نگار: گائی ریچٹ۔ صفحہ 91۔نگارشات پبلشرز ،لاہور (2016)

Ghumshoda Tehzeebo ki dastan, Tarjuma: Muhammad Yahya Khan, Mazmoon Nigar: Gai recht,P:91, Nigar Shat Publishers, Lahore (2016).

[41] سورۃالصافات:99

Surh Al-Saafat:99.

[42] کتاب پیدائش،باب12۔آیت2-1

Kitab-e-Pedaish, Bab:12, Verse:1-2.

[43] سورۃالتوبہ:114

Surh Al-toba:114.

[44] سورۃالعنکبوت:26

Surh Ankaboot:26.

[45] Lorinda Munson Bryant, Pictures and Their Painters: The History of Painting, John Lane Company, 1907, Harvard University, page 6

[46]https://www.ucl.ac.uk/museums-static/digitalegypt/literature/nefertytransl.html

[47] بائیبل۔کتابِ پیدائش،باب12

[48] علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، مترجم: حکیم احمد حسن، جلد اول، نفیس اکیڈمی، طبع ۲۰۰۳، صفحہ 55

[49] http://www.ancient-egypt.org/from-a-to-z/t/turin-king-list.html (3 Dec 2022)

[50]Fluctuating radiocarbon offsets observed in the southern Levant and implications for archaeological chronology debates, https://www.pnas.org/doi/10.1073/pnas.1719420115

[51] حوالہ ایضاً

Ibid.

[52]https://www.nationalgeographic.com/culture/article/radiocarbon-dating-explained